R. No. 2186/57

Regd. No. A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 2

Telegrams "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپے
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
[illegible]

جلد ۲۱ - شمارہ ۴۱	ایڈیٹر - آل احمد سرور	علی گڑھ - یکم نومبر ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر سید ناجعفری

ڈاکٹر زور مرحوم

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

زور صاحب دکنی تہذیب، دکنی زبان اور دکنی ادب کے سب سے بڑے رسیا تھے۔ دکن کی ثقافت اور زبان و ادب کی انھوں نے والہانہ پرستش کی، اس کی روایات کے گُن گائے اور اس چمن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری بھی کی۔ اُردو سے انھیں بے پناہ محبت تھی اور انھوں نے اس محبت کا حق ادا کر دیا۔ ایوان اُردو زور صاحب کے لئے سنگ و خشت کی ایک خوبصورت عمارت ہی نہیں تھی، ان کے خوابوں کی تعبیر، ان کے تخیل کا رنگ محل، ان کی مشقوں اور آرزوؤں کی جادو نگری اور ان کا "شہر آرزو" تھا۔ جب تک ادارہ ادبیات اُردو کی ایک کتاب اور ایوان اُردو کی ایک اینٹ بھی باقی رہے گی، لوگوں کے دلوں سے زور صاحب کی یاد محو نہ ہو سکے گی۔ ادارے اور انسٹی ٹیوٹ کے کاروبار ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے سفر اور حضر میں ان کے خیال سے غافل ہونا زور صاحب کے لئے ناممکن تھا۔ ڈاکٹر زور کے بعض احباب ان کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ایک رات یکایک طوفانی بارش شروع ہو گئی، زور صاحب چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ سب سے پہلے انھیں ایوان اُردو کے دارالمطالعے کا خیال آیا (اس میں جالی لگی ہوئی ہے اور یہاں میزوں پر ہند و پاکستان کے تمام معیاری رسالے مطالعے کے لئے رکھے جاتے ہیں) اکثر زور سے ہوا چلے یا زیادہ بارش ہو تو پانی اندر بھی آجاتا ہے۔ اس خیال سے زور صاحب بے چین ہو گئے کہ کہیں تمام رسالے بھیگ کر خراب ہو جائیں۔ انھوں نے اپنے کمرے کا سوئچ آن کیا لیکن روشنی ندارد تھی کیونکہ فیوز جل گیا تھا۔ بے وقت تمام مکان کے کسی گوشے سے قندیل اُٹھا لائے اسے روشن کیا اور بھیگتے ہوئے ایوان اُردو پہنچے۔ چوکیدار کو بیدار کیا اور دونوں نے مل کر تمام رسالے محفوظ مقام پر پہنچا دیئے اور انھیں خبر بھی نہ ہوئی کہ اس مشقت میں رات کا کتنا حصہ گزر گیا۔

زور صاحب نے نہ جانے کتنے ادیبوں اور شاعروں کو گمنامی کی تاریکی سے باہر نکالا، کتنے حسن کاروں کے ساتھ انصاف کیا، کتنے شاعروں کو تاج پہنائے، کتنے ادیبوں کو ان کا حق دلایا۔ اور کتنی بھولی بسری یادوں کو صفحۂ قرطاس پر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ دکن کے ایک ایک ذرّے سے انھیں پیار تھا وہ اس سرزمین کی معمولی سے معمولی روایت کا بھی احترام کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دکن کے سب ہی قدیم شاعروں اور ادیبوں کے فنی اکتسابات منظر عام پر آجائیں اور اس مقصد کی لگن میں انھوں نے تاریخ ادب اُردو کے ایک بڑے خلاء کو پُر کر دیا۔ انھوں نے سختیاں جھیلتے اور راستے کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اورنگ آباد، بیدر، گلبرگہ، بیجاپور اور حیدرآباد کے سیکڑوں مواضعات کا سفر کیا اور بہت سے ہیرے جو خس و خاشاک کے انبار میں دب گئے تھے ڈھونڈھ نکالے۔ ایک سچے محقق کی طرح وہ تحقیق کے کسی گوشے کو ادھورا چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ شاعر کے حالاتِ زندگی اور اس کے ادبی کارناموں کی تلاش کے علاوہ وہ ان کی ابدی خوابگاہوں کو بھی ڈھونڈھ نکالتے۔ ان پر روشنی کا انتظام کرواتے، لوحِ مزار نصب کرائی جاتی اور وہ ان کی تعمیر و ترمیم میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ دکن کے ایک شاعر فیض کے مزار کے متعلق انھوں نے مجھے ایک بڑا دلچسپ واقعہ سنایا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے بڑی تلاش اور تحقیق کے بعد [illegible]

مدفون ہیں۔ یہاں ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ قبریں انتہائی شکستہ حالت میں تھیں اور ہر طرف مٹی کے ڈھیر اور کوڑا کرکٹ کے انبار لگے ہوئے تھے، یہاں دریافت کرنے پر لوگوں نے فیض کی قبر کی نشاندہی کی۔ زور صاحب کہتے تھے کہ یہ قبر دوسری قبروں کے مقابلے میں بہت صاف اور گرد و غبار سے پاک تھی مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس ویرانے میں فیض کے مزار کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔ غرض میں اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایت کرنے کے بعد گھر واپس آگیا۔ مجھے بار بار یہی فکر ستاتی تھی۔ میں نے فیض کا دیوان اٹھا لیا، اسی تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے دیوان کھولا۔ اب جو پہلے صفحے پر نظر کی تو یہ شعر لکھا تھا:-

موجۂ بادِ بہارِ چمنستانِ بہشت
مشہدِ فیض پہ جاروب کشی کرتا ہے

اور اس شعر کو پڑھ کر مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

جن لوگوں نے قدیم ادب پر تحقیقی کام کیا ہے وہ اس بات سے واقف ہیں کہ قدیم دکنی مخطوطات کا پڑھنا اور سمجھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ جن اسکالرز نے سالہا سال تک دکنی ادب پر کام کیا ہے وہ بھی ان مخطوطات کے مطالعے میں دقت محسوس کرتے ہیں کیونکہ کاغذ کی کہنگی، زبان کی اجنبیت اور خط کی قدامت اور خرابی کے باعث جگہ جگہ ناطقہ سربگریباں ہو جاتا ہے۔ بعض کاتبوں کو مرکزوں اور شوشوں سے بغض ہوتا ہے، بعض کاتب کاغذ سے قلم اٹھانا جانتے ہی نہیں، جب صفحہ ختم ہوتا ہے اسی وقت وہ قلم اٹھاتے ہیں۔ اکثر نسخوں میں حروف ایک دوسرے میں اتنے گتھے ہوئے اور ایک لفظ دوسرے لفظ سے اتنا پیوستہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ دنوں سر مارئیے ایک پیراگراف یا ایک بند بھی پڑھا نہیں جا سکتا۔ زور صاحب میں مخطوطات کو پڑھنے کی بڑی غیر معمولی صلاحیت تھی اور وہ نئے حاصل کئے ہوئے مخطوطے کو پہلی بار اس روانی، بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ پڑھ ڈالتے جیسے ہم اخبار یا کوئی رسالہ پڑھتے ہیں۔ تقریباً چالیس سال سے انھیں دکنی مخطوطات پڑھنے کی مشق تھی۔ زور صاحب کہا کرتے تھے کہ زمانہ طالب علمی میں ان کا پروگرام یہ ہوتا تھا کہ وہ اور پروفیسر سید محمد روزانہ شام میں حیدرآباد کی مختلف لائبریریوں میں بیٹھ کر مخطوطات کا مطالعہ کرتے تھے یہاں تک کہ رات ہو جاتی۔

ایک دفعہ نواب عنایت جنگ بہادر نے ان کے پاس "من سمجھاون" کا ایک مخطوطہ بطور تحفہ روانہ کیا۔ اس مخطوطے کو آئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ میں زور صاحب کے یہاں پہنچی۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا۔ ہماری لائبریری کے لئے آج ایک بڑا نایاب اور کارآمد مخطوطہ آیا ہے اگر آپ اسے ایڈٹ کریں تو ایک اچھا کام ہو جائے گا۔

اس کے بعد زور صاحب نے پہلے بند سے نظم "من سمجھاون" سناتے رہے، گویا وہ سلیس زبان میں خوش خط لکھی ہوئی کوئی کہانی پڑھ رہے ہوں۔ کمرے میں جو حضرات بیٹھے ہوئے تھے وہ دنگ رہ گئے۔

میں ایک عرصے تک اس موضوع پر کام کرتی رہی اور اس کے دوسرے نسخوں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا لیکن ایک لفظ کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کسی مخطوطے میں یہ لفظ حسرت، کسی میں جنتر اور کسی میں حیرت لکھا ہوا ملا اور ان الفاظ سے مصرعے کا مفہوم زیادہ میل نہیں کھاتا تھا۔ میں نے زور صاحب سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا "یہ لفظ نہ تو حسرت ہو سکتا ہے اور نہ جنتر اور حیرت ہے بلکہ یہ تو دکنی لفظ 'جتر' ہے"۔ اس کے بعد انھوں نے ایک بڑی عجیب و غریب بات کہی، کہنے لگے "اس مخطوطے کا کاتب بوڑھا اور سن رسیدہ شخص معلوم ہوتا ہے"۔ میں نے پوچھا "یہ آپ نے کیسے جانا" زور صاحب نے جواب دیا بوڑھے کاتب اپنے ضعف اور رعشے کی وجہ سے اکثر شوشے بڑھا دیتے ہیں اور یہ کہ قلم کو نیچے اوپر حرکت دینے کی زحمت سے بچنے کے لئے اکثر لفظ میں جتنے نقطے ہوتے ہیں وہ صرف اوپر یا صرف نیچے لگا دیتے ہیں۔ بعد میں یہ غور کرکے مجھے انتہائی حیرت ہوئی کہ اس مخطوطے میں اکثر و بیشتر جگہ ایسا ہی کیا گیا تھا۔ زور صاحب کا اندازہ صد فی صد صحیح تھا۔

دکنی ادب گویا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انھیں اس سے غیر معمولی محبت تھی اور وہ اس کی کسی کمزوری یا کوتاہی کو تسلیم کرنے کے لئے بڑی مشکل سے تیار ہوتے تھے۔ ان کا حافظہ بھی اس غضب کا تھا کہ انھیں وجہی، نصرتی، غواصی اور خاص طور پر محمد قلی قطب شاہ کے بلا مبالغہ سیکڑوں شعر یاد تھے۔ شعر بہت سے لوگوں کو حفظ ہوتے ہیں، لیکن نثر کے مسلسل کئی پیراگراف، مخطوطات کے نمبر اور ان کی الماریاں یاد رکھنا غیر معمولی حافظہ رکھنے والوں ہی کا کام ہے۔ ایک دفعہ مجھے "گیان سروپ" کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی اور میں نے زور صاحب سے اس مخطوطے کو حاصل کرنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے کہا "اوپر کے برآمدے میں جو کانچ کی نئی الماریاں رکھی گئی ہیں ان میں کی آخری الماری کے تیسرے خانے میں سیدھے ہاتھ کی طرف یہ مخطوطہ ملے گا۔ دوسرے دن جب جمال الدین صاحب مجھے اوپر لے گئے تو "گیان سروپ" اُسی مقام سے نکالی جس کا پتہ زور صاحب نے بتایا تھا۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

ہماری زبان

یکم نومبر ۱۹۶۲ء

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر

نیفا اور لداخ میں چینی فوجوں نے ہندوستانی فوجوں پر جو حملہ کیا ہے وہ بقول ہمارے محبوب وزیراعظم کے بین الاقوامی قانون کے لحاظ سے ایک جرم اور پنچ شیل کے اصولوں پر ایک کاری ضرب ہے۔ ہندوستان ایک امن پسند ملک ہے اور اب تک اختلافات کو باہمی گفتگو کے ذریعے سے طے کرنے کا عادی رہا ہے۔ اُس نے کسی فوجی گٹھ جوڑ میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ بین الاقوامی گروہ بندی میں وہ ہمیشہ غیر جانب دار رہا ہے۔ چین نے ہندوستان کی سرحد پر حملہ کر کے نہ صرف ہندوستان کو دھوکہ دیا ہے بلکہ امن اور انسانیت کے تمام اعلیٰ خیالات کے خلاف غداری کی ہے۔ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ جب صلح کی بات کرتا ہے تو اس کا مطلب دنیا کو ایک فریب میں مبتلا کرنا ہوتا ہے تاکہ صلح کے پردے میں وہ اپنی فوجیں آگے بڑھا سکے اور اپنی فوجی طاقت سے اُن لوگوں کو مرعوب کرے، جو اس کی باتوں پر اعتبار کرتے تھے۔ ہندوستان کے خلاف لڑائی چھیڑ کر اُس نے اپنے اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شروع کے چند دنوں میں ہماری فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑا، مگر اب چینیوں کو بڑی حد تک روک لیا گیا ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار سست ہو گئی ہے۔ اِدھر ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ تمام ہندوستانیوں میں بڑا جوش ہے۔ چینیوں کے خلاف سخت غصّے اور نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور ہر قیمت پر ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے اور اُس کے ایک ایک چپّے کی حفاظت کرنے کے لیے سبھی مستعد ہیں۔ اس نازک وقت میں تمام مسائل کو پس پشت ڈال کر ملک کی حفاظت میں تن من دھن کی بازی لگانا فرض ہو گیا ہے۔ شاید بقول جواہر لال نہرو، ہم لوگ ان پندرہ برسوں میں کچھ نرم پڑ گئے تھے۔ یہ فطرت کا تازیانہ ہے اور یقین ہے کہ اس کے اثر سے ہم خوابِ غفلت سے بیدار ہوں گے، ہماری فطری صلاحیت اُبھرے گی اور ہم مل کر ملک کی اور اپنی آزادی کی حفاظت کریں گے اور ہندوستان کا جھنڈا ہر حال میں اونچا رکھیں گے۔

عام زندگی کے مسائل ایک حد تک تو چلیں گے، مگر کانفرنسوں، جلسوں اور دوسرے ہنگاموں کا یہ وقت نہیں۔ بہت سی کانفرنسیں اور تقریبیں ملتوی ہو گئی ہیں، انجمن کی کانفرنس بھی صدر سے مشورے کے بعد ملتوی کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اُردو دوستوں کو جو زحمت ہوئی اس کے لیے ہم معذرت چاہتے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ تمام اُردو دوست دوسرے بھائیوں کے ساتھ اس وقت ہر کام میں پنڈت جواہر لال نہرو کے اور ہندوستانی حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں گے۔ اقبالؔ نے جنگ اور صلح کی زندگی کے متعلق بڑے پتے کی بات کہی ہے:۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

ایک اور جگہ کہا ہے:۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

یہ وقت سیرتِ فولاد پیدا کرنے کا ہے، حریر و پرنیاں ہونے کا وقت گزر گیا ہم بہت عرصے تک جوئے نغمہ خواں کی طرح رہے، اب ہمارا فرض ہے کہ سیلِ تند رو کی طرح کوہ و بیاباں سے گزریں۔ ہمیں یقین ہے کہ فتح ہماری ہو گی اور ہماری مقدس سرزمین سے حملہ آوروں کو بیک بینی و دو گوش نکلنا پڑے گا۔

کُل ہند اُردو کانفرنس کا التوا

ملک میں ہنگامی حالات کے اعلان کے بعد انجمن ترقی اُردو کی کل ہند کانفرنس جو ۲۴-۲۵ نومبر کو جے پور میں ہونے والی تھی، ملتوی کر دی گئی ہے۔

الہ آباد میں ظفر کی صد سالہ برسی کی تیاریاں

الہ آباد۔ ۲۴ر اکتوبر، وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے الہ آباد کی بہادر شاہ ظفر کمیٹی کی ہمت افزائی کرتے ہوئے اس کے پروگرام کو سراہا اور کہا کہ بہادر شاہ ظفر کی برسی ضرور منانی چاہیے، یہ ایک اچھا اقدام ہے۔

الہ آباد کی ظفر کمیٹی کے ایک وفد نے وزیراعظم سے ابھی حال میں ملاقات کی اور پروگرام کی تفصیل سے انھیں آگاہ کیا۔ وزیراعظم نے پروگرام کو پوری دلچسپی کے ساتھ سُنا اور کمیٹی کی پہلی رسید پر خود اپنے ہاتھ سے چندہ دہندگان کی جگہ اپنا نام تحریر کیا اور ایک گراں قدر عطیہ دیا۔

انجمن ترقی اُردو ویرگام

انجمن کی مقامی شاخ کا پہلا سالانہ اجلاس ۲۲ر ستمبر کی شب کو منعقد ہوا جس میں گزشتہ سال کا حساب منظور کرنے کے بعد سال نو (۶۳ - ۶۲ ۱۹ء) کے لئے انتخاب عمل میں آئے۔ سال نو کی مجلس انتظامیہ میں حسب ذیل حضرات باتفاق آراء منتخب ہوئے ہیں :-
شمس الدین محمود میاں پیرزادہ ایڈوکیٹ، صدر، جعفر بھائی حسن بھائی پنارو والا بی۔ اے۔ نائب صدر، عبدالقادر عبدالکریم میمن ادیب، جنرل سکریٹری، فقیر محمد حاجی درویش بھائی گھانچی جوائنٹ سکریٹری، قاسم بھائی حاجی آدم بھائی منڈلی، خازن، اور اراکین مجلس عبدالمجید عبدالرحیم شیخ ایم۔ اے، میمن گل محمد عثمان بھائی، داؤد بھائی سیابجی بھائی پٹیل ایڈوکیٹ، میمن عبداللطیف دوست محمد، حافظ محمد عباس حسین بھائی بوہرہ اور سید شہاب الدین میاں صاحب۔

ادنیارہ (ضلع ٹونک) میں انجمن ترقی اُردو کا قیام

۲۰ر اکتوبر کو حسب تحریک مولانا سید قاضی الاسلام صاحب قاضی شہر ٹونک، قصبہ ادنیارہ ضلع ٹونک کے ہمدردان اُردو کا ایک عام جلسہ ہوا، جس میں قصبہ کے قومی، ملکی اور لسانی امور سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات نے شرکت کی۔ منشی مقبول حسین خاں صاحب نے انجمن ترقی اردو ضلع ٹونک کی جانب سے آمدہ خط برائے قیام شاخ انجمن ترقی اُردو، پڑھ کر سنایا۔ جلسے نے متفقہ طور سے طے کیا کہ اُردو زبان وادب کی بقاء تحفظ اور اس کی ترویج واشاعت کے لئے ادنیارہ میں بھی انجمن کی شاخ قائم کی جائے۔ چنانچہ اسی وقت انجمن کی ممبر سازی کی گئی۔ اور فی کس ایک روپیہ فیس ممبری لے کر ۲۵ ممبر بنائے گئے۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل حضرات کا انتخاب بحیثیت عہدیداران وممبران باتفاق رائے عمل میں آیا۔
صدر، منشی مقبول حسین خاں صاحب، سکریٹری محمد اسمٰعیل صاحب، خزانچی۔ جناب اشرف بھائی صاحب آہن گر۔
ممبران مجلس عاملہ کے نام یہ ہیں :- غفور خاں صاحب، عطاء اللہ خاں صاحب، فقیر محمد صاحب، غلام حامد خاں صاحب، اللہ بندہ صاحب، مقبول صاحب اور اختر بابو صاحب۔

انجمن ترقی اُردو اُوجین

۱۰ر اکتوبر کو انجمن ترقی اُردو اوجین کا جلسہ زیر صدارت اے این شمیم صاحب منعقد ہوا۔ سلطان احمد صدیقی جنرل سکریٹری نے مرکزی انجمن کی جانب سے موصول گشتی اور پروگرام آل انڈیا اردو کانفرنس بے پور اجتماع پڑھ کر سنایا۔
اوجین کارنگ میلہ اور نمائش کے سکریٹری کی جانب

حسب سابق اس سال بھی انجمن ترقی اُردو کی جانب تمثیلی مشاعرہ یا ڈرامہ کیا جائے جس میں اُردو کے متعلق مفید معلومات ہوں۔
آخر میں حضرت نوح ناروی اور ڈاکٹر محی الدین زور قادری کی وفات پر صدر کی جانب سے تعزیتی تجاویز پیش کی گئیں جسے حاضرین نے کھڑے ہو کر منظور کیا۔ آخر میں حضرت فراق گورکھپوری کی صحت کے لئے دُعا بھی کی گئی۔

انجمن ترقی اُردو کلکتہ

حسب اعلان انجمن ترقی اُردو کلکتہ کے زیر اہتمام ۹ر ستمبر ۶۲ ۱۹ء کو "اُردو ہال" میں یوم اکبر الٰہ آبادی منایا گیا۔ ل احمد اکبر آبادی نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔
جلسے کا افتتاح حضرت اکبر الٰہ آبادی کی مشہور نظم "برق کلیسا" سے ہوا۔ اس کے بعد عبدالستار شاہدی نے اپنا مقالہ "اکبر کا فن" پیش کیا۔ سالک لکھنوی نے اپنی تقریر میں اکبر کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ آخر میں ل احمد اکبر آبادی نے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں آپ نے اپنے مخصوص پر وقار انداز میں اکبر کی شاعری کی مختلف خصوصیات پر روشنی ڈالی اور مثالوں کے ذریعے انھیں واضح کیا۔

انجمن ترقی اُردو جودھپور

انجمن ترقی اُردو جودھپور کے زیر اہتمام متعدد مشاعرے منعقد ہوئے جن میں سے تین نہایت شاندار اور کامیاب رہے۔ ان میں سے پہلا مشاعرہ۔ ۱۵ر اگست یوم آزادی کی تقریبات کے سلسلے میں گوردھن لعل صاحب کی صدارت میں ہوا۔ دوسرا مشاعرہ۔ ۸ر ستمبر کو زیر صدارت قاضی عبدالجلیل صاحب منعقد ہوا۔ اور تیسرا مشاعرہ۔ ۱۳ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء کو بھارت بھوشن راج صاحب کے مکان پر زیر صدارت جناب وحید اللہ خاں صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو جودھپور ہوا۔

انجمن ترقی اُردو شاخ دہلی

۲۱ر اکتوبر کو انجمن ترقی اُردو شاخ دہلی کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں ڈاکٹر محی الدین زور اور نوح ناروی کی وفات پر تعزیتی تجویزیں منظور کی گئیں۔

شاعر لکھنوی صدر انجمن ترقی اُردو مونگیر کا انتقال

۱۲ر اکتوبر کو حکیم سید باقر حسین شاعر لکھنوی کا دل کے عارضے میں بمقام مونگیر انتقال ہو گیا۔
مرحوم انجمن ترقی اُردو شاخ مونگیر کے صدر تھے اور انجمن کے کاموں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ۲۰ر اکتوبر کو انجمن ترقی اُردو شاخ مونگیر کا ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں مرحوم کی

...ترا سا اکبرآبادی

دیوالی کی رات

رات نے زلفیں سنواریں، دیپ روشن ہو گئے
روشنی نے کروٹیں بدلیں، اندھیرے کھو گئے
نیند کی پریوں نے جب نغمہ سُنایا پیار کا
نیلے امبر کی فضاؤں میں ستارے سو گئے

رات کی رانی کے نازک جسم سے خوشبو اُڑی
جھوم کر گانے لگی ہر شاخ پر گل کی کلی
صحنِ گلشن میں چلی جب عطر میں بھیگی ہوا
مست نرگس نے مچل کر آنکھ اپنی کھول دی

آج دیپک راگ فطرت گنگناتی ہے ندیم
آج دنیا روشنی سے جگمگاتی ہے ندیم
آج ہر رنج و الم کو میری طرح بھول جا
مُسکرا تو بھی کہ دنیا مُسکراتی ہے ندیم

اک سُہاگن کی طرح ہر زندگی مسرور ہے
اک شرابی کی طرح ہر آدمی مخمور ہے
ہر روش پر جھومتا پھرتا ہے خوشیوں کا ہجوم
آج غم کا دیوتا دنیا سے کافی دور ہے

...رفعت سروش

شاعر

جب کوئی پھول کھلا
میں یہ سمجھا کہ مرے دل کا ہی غنچہ چٹکا
جب کوئی اشک بہا
میں یہ سمجھا کہ مری آنکھ کا تارا ٹوٹا
جب کوئی ساز بجا
میں یہ سمجھا کہ مرے دل نے ہی نغمہ چھیڑا
آپ کا غم ہے مرا، آپکی خوشیاں میری
روحِ شعر آپ کے دم سے ہے غزلخواں میری

...ثمر انصاری نکاروی

"آہ ناخدائے سخن"

حضرت نوح ناخدائے سخن — زندگی جن کی تھی برائے سخن
اُن کی رحلت سے واقعہ ہے یہ — ہو گئی ختم اب ضیائے سخن
جانشین جناب داغ تھے وہ — فی الحقیقت تھے رہنمائے سخن
فکرِ تاریخ سال گر ہے ثمر — لکھ دو تم "آہ ناخدائے سخن"
۱۳۸۲ھ

وقار خلیل

آہ ڈاکٹر زورؔ

ایک پیغام تھا اک نغمۂ سازِ ہستی
خوش و خورشید سحر شعلۂ مستقبل تھا
اے دکن! وادئ کشمیر میں سونے والا
تیری تاریخ تمنا کا دھڑکتا دل تھا
حال و ماضی ہی نہیں بلکہ پئے شکل اردو
زورؔ کے ہاتھ میں آئینۂ مستقبل تھا

غزلیں

کیلاش ماہر

اتنی بھی رفاقت غمِ تنہائی سے کب تھی — اکثر تری قربت میں بھی رنجیدہ رہے ہیں
وہ عہدِ جفا ہو کہ ترا عہدِ وفا ہو! — عادت ہی کچھ ایسی ہے کہ سنجیدہ رہے ہیں
سوچا تھا سکوں ہوگا یہیں ترکِ وفا سے — سائے سے مگر ذہن پہ لرزیدہ رہے ہیں
پہ ذکرِ ستم پرسشِ غم دیدۂ نم کیا — دیوانے تو بے وجہ بھی رنجیدہ رہے ہیں

سید حرمت الاکرام

قصرِ مہتاب سے رنگین سا پیام آتا ہے! — دل دھڑکتا ہے تو دھڑکے ہی چلا جاتا ہے
ابروئے صبح کے آنے میں گھڑی دو ہے ابھی — کوئی بھولا ہوا قصہ مجھے یاد آتا ہے
راز داں اُٹھ گیا شاید کوئی آنکھوں کا تری — اہتمامِ مے و مینا کا بھرم جاتا ہے
کیسے بتلاؤں کہ ویرانۂ دل میں حرمتؔ — شمع سی کون سرِ شام جلا جاتا ہے

حامدی کاشمیری

تری نگاہ سے ہم التفات لے کے چلے — نئی حیات، نئی کائنات لے کے چلے
قدم قدم پہ نئی منزلوں نے دی آواز — ہم اپنے عزم و یقیں میں ثبات لے کے چلے
وہ اجنبی سی ملاقات تھی کہ محشر تھا — ہم اپنے دل میں حسیں واردات لے کے چلے
ہم آئے حامدیؔ محفل میں آ گئی رونق — چلے تو رونقِ محفل بھی ساتھ لے کے چلے

عطاء الرحمٰن ارشاد

دل سوز دل فگار نظارو کہاں ہو تم؟ — اے میری زندگی کے سہارو کہاں ہو تم؟
آؤ تمھیں کو شرحِ غمِ دل سُنائیں ہم — اے آسماں کے چاند ستارو کہاں ہو تم؟
یہ رات، یہ سکوت، یہ تنہائی الاماں — کاش ایسی رات تم بھی گزارو کہاں ہو تم؟
ارشادؔ نے تمھیں تو پکارا ہزار بار — تم ایک بار اُس کو پکارو کہاں ہو تم؟

نور الدھر سروش

زمیں کے ساتھ دشمن آسماں ہوگا تو کیا ہوگا — مرا غم بھی گراں بارِ جہاں ہوگا تو کیا ہوگا
نظر کی سرکشی تابِ گراں ہے ضبطِ انساں کو — خوشی جب مرا طرزِ بیاں ہوگا تو کیا ہوگا
باہر ظلم و ستم میرا تبسم ریز ہو جاتا — مذاقِ اہلِ زنداں پر گراں ہوگا تو کیا ہوگا
سروشؔ اب تک زمانہ ہم سے بیگانہ سا ہے — مرا احساس بھی دیدہ گراں ہوگا تو کیا ہوگا

مراسلات

سیٹھ گوبند داس اور اردو زبان

سیٹھ گوبند داس اپنی ملکی خدمات اور ہندی نوازی کی وجہ سے ملک میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ مدھیہ پردیش کے ایک متمول اور برگزیدہ خاندان کے فرد ہیں۔ جنگ آزادی کے سلسلے میں قید و بند کی مصیبتیں سہیں، کانگریس تحریک میں نمایاں حصہ لیا، ورکنگ کمیٹی کے رکن رہے، اور اب پارلیمنٹ کے سب سے پرانے ممبر ہیں۔ انھوں نے ہندی ادب کے فروغ اور ہندی کو قومی زبان کا درجہ دلانے میں مسلسل اور کامیاب جہاد کیا۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں پہلے پہل انھوں نے ہندی کے حق میں آواز بلند کی جبکہ انگریزی نہ صرف ہماری حکومت کی زبان تھی بلکہ ہمارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ آپ دو مرتبہ مدھیہ پردیش ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر رہے اور سنہ ۱۹۶۱ء میں "اکھل بھارتیہ ہندی سمیلن" کے صدر منتخب ہوئے۔ سیٹھ صاحب ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور مشہور ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے ڈراموں کی تعداد سو سے متجاوز ہو گئی ہے۔ عمر بھر کی ادبی خدمات کے سلسلے میں جبل پور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ اور سرکار ہند سے پدم بھوشن کے خطاب سے سرفراز ہو چکے ہیں۔

سیٹھ صاحب کے متعلق اردو داں طبقہ میں کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اور ان کے متعلق یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ وہ اردو کے دشمن ہیں۔ مجھے ان سے کئی مرتبہ ملنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ ہندی کے لئے ان کے دل میں بے حد محبت ہے لیکن اردو یا ہندوستان کی دوسری زبانوں کے لئے تنگ دلی یا منافرت کا جذبہ نہیں۔ ملاقات کے دوران میں انہوں نے اردو کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے وہ ہماری زبان کے ناظرین کے لئے باعث دلچسپی ہوں گے۔ وہ فرماتے ہیں :-

(۱) میں صرف ہندی کا حامی ہی نہیں بلکہ اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کا بھی مددگار ہوں۔ آئین میں اردو کو ایک قومی زبان [illegible] گیا ہے۔ میری نظر میں وہ اس درجہ کی مستحق ہے۔ اردو کو صرف ایک [illegible] سمجھنے کا زمانہ تو اسی وقت ختم ہو گیا جب آئین نے بجا طور پر اس کی قومی حیثیت تسلیم کر لی۔

(۲) اردو کو وہی درجہ ملنا چاہئے جو ہماری دوسری قومی زبانوں کو حاصل ہے۔ اردو کم و بیش سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کا ملک بھر میں ایک خاص مقام ہے۔

(۳) سہ لسانی فارمولا میں اردو بخوبی شامل کی جا سکتی ہے اور اس کی تعلیم و تدریس کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

(۴) میں اردو کو کسی فرقہ یا مذہب کی زبان نہیں سمجھتا۔ بلکہ وہ ہماری مشترکہ تہذیب کا ایک نشان ہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک عمل سے وجود میں آئی ہے۔

(۵) جو فارسی، عربی یا انگریزی کے الفاظ ہماری روزمرہ کی زبان یا ادب میں آ گئے ہیں، ان کو جوں کا توں برقرار رکھنا چاہئے اور آئندہ بھی ان زبانوں کے الفاظ کی آمد کے لئے دروازہ کھلا رہنا چاہئے۔ ان زبردستی فارسی، عربی یا سنسکرت کے الفاظ ٹھونسنے کی کوشش [illegible] غلط ہے، اور اسی بنا پر ہمارے ریڈیو کی زبان ہونی چاہئے۔

سیٹھ صاحب کے کئی ڈرامے مسلم یا مغل عہد حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً شیر شاہ اور مغل کال میں بھارت کی ایک جھلک۔ ان ڈراموں کے مطالعہ سے آپ کا جذبۂ حب الوطنی اور ہندو مسلم اتحاد میں یقین راسخ کا اظہار ہوتا ہے۔ سیٹھ صاحب اپنے مشترکہ قومی سرمایہ کو عزت اور فخر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان ڈراموں کی زبان کئی مقامات پر فصیح اردو ہے۔

جے کرشن چودھری (ریٹائرڈ) آئی۔ اے۔ [illegible]

کچھ عبد السلام نمبر کے بارے میں

میرے مخدوم و محترم بزرگ مولوی ابو علی اعظمی صاحب نے میرے مرتب کردہ دو عبد السلام نمبروں پر از راہ خورد نوازی تبصرہ فرمایا ہے جو ۲۲ ستمبر ۶۲ء کے ہماری زبان میں شائع ہوا ہے۔ مجھے موصوف کی چند آراء سے اختلاف ہے اسی بنا پر یہ سطریں قلم بند کر رہا ہوں۔

سب سے پہلی بات جو موصوف نے سپرد قلم فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ معارف کے "سلیمان" نمبر کے تجربے نے ارباب معارف کو اس بات سے قاصر رکھا کہ وہ "عبد السلام نمبر" ترتیب دیں۔ موصوف کے نزدیک اس کی دو وجہیں ہیں، ایک تو یہ کہ سید صاحب مولانا ان کے نزدیک صاحب شعر الہند کے مقابلے میں کہیں بزرگ و برتر تھے اور ان کے سلسلے ہی میں اتنی سرد مہری کا مظاہرہ کیا گیا کہ اس بات کی توقع نہ رہ گئی کہ ان سے کم اہم شخصیت [illegible] نمبر مقبول ہو سکے گا۔ دوسری وجہ یہ بیان [illegible] ہے کہ اگر نمبر نکالا بھی جاتا تو لکھنے والے کہاں سے آتے؟ میں نے دونوں ہی تجربے کئے اور بحمد اللہ کامیاب [illegible]۔ شبلی کالج میگزین کا خاص نمبر ڈیڑھ ہزار چھپوایا گیا تھا۔ ایک ہزار کا پیاں طلبہ میں تقسیم ہوئیں اور پانچ سو کاپیاں صرف تین ماہ کی مدت میں بک گئیں۔ یہی حال ادیب کے عبد السلام نمبر کا رہا۔ اس کی تین سو کاپیاں زیادہ چھپوائی گئی تھیں اور اب گزشتہ تین ماہ سے اس کی کوئی کاپی دفتر ادیب میں باقی نہیں رہی۔ جہاں تک لکھنے والوں کا سوال ہے تو وہ مضامین جو میں نے اپنی محدود دوڑ دھوپ سے حاصل کئے معارف کو بھی مل سکتے تھے اور ارباب معارف اپنے اثر و رسوخ سے دوسرے اہل قلم حضرات سے مقالے حاصل کر سکتے تھے۔ خلیل الرحمن اعظمی صاحب کی شکایت اپنی جگہ پر بجا ہے۔

دوسرا سب سے بڑا ستم میرے مخدوم نے مجھ پر یہ کیا ہے کہ انھوں نے میرے طبع زاد پلان "معارف کے منتخبہ عبد السلام نمبر کی تمثیل" قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں فیض الرحمن اعظمی صاحب اور شبلی کالج میگزین کے سرپرست علی حماد عباسی صاحب گواہ ہیں کہ یہ خیال میرا طبع زاد تھا۔ اور میں نے ایک ایک شخص کی خوشامد کر کے صباح الدین عبد الرحمن، فیض الرحمن اعظمی، علی حماد عباسی صاحبان سے مقالے لکھوائے۔ اس کے علاوہ اثر لکھنوی صاحب، ڈاکٹر محمد عزیز صاحب، مولانا ابو ظفر ندوی مرحوم کے وہ خطوط جو میرے پاس محفوظ تھے میں نے [illegible]

شاہد ہیں کہ وہ بلاں میرا تھا۔

موصوف سے مجھے دوسرا اختلاف شاہ صاحب اور صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے مقالوں کے متعلق ہے۔ میں بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جس کو ان دونوں مقالوں میں عناد کی بو آتی ہے اور جن میں اس بات کی شعوری کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کو ہسٹری' پاگل، دیوانہ، کے روپ میں پیش کیا جائے اور ان کی قدر و قیمت گھٹائی جائے اور پھر اس طرح ان مقالوں کو مجذوب کی بڑ کہہ دیا جائے جن میں سے ایک ان کے انتقال کے بعد ثقافت لاہور میں شائع ہوا جس کا موضوع تعدد ازدواج تھا اور دوسرا وہ مقالہ ہے جس پر میں نے ادیب کے عیسیٰ علیہ السلام نمبر میں مذہبی افکار کے تحت بحث کی ہے۔

تیسرا اختلاف مجھے شعر العرب کے سلسلے میں ہے۔ یہ مرحوم کا طبع زاد کارنامہ نہیں ہے بلکہ جرجی زیدان کے افکار کا ترجمہ ہے اور ان کے مسودوں میں شعر العرب کا مسودہ بھی موجود ہے جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لئے موصوف کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ کتاب " بدقسمتی سے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی"۔

آخر میں اتنا اور عرض کردوں گا کہ موصوف نے میرے جس سہو کی نشان دہی فرمائی ہے اس کے لئے ان کا مشکور ہوں۔

(کبیر احمد جائسی)

دہلی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجوزہ عمارت کا نام

"ہماری زبان" میں چند مہینے قبل یہ تجویز شائع ہوئی تھی کہ انجمن ترقی اردو ہند کے مرکزی دفتر کا نام "غالب ہاؤس" رکھا جائے۔ مجھے یہ نام پسند نہیں آیا۔ پہلے تو ہاؤس کا لفظ اردو میں مکان، بنگلہ، کوٹھی، محل وغیرہ کے ہوتے کبھی کھپ نہیں سکے گا۔ دوسرے غالب سے اردو کی تخصیص بھی مناسب نہیں۔ غالب کے اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ مگر ان کے بہترین شاعر ہونے میں ضرور اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ "یادگار غالب" کے مصنف نے تو "شعر و شاعری" کے مقدمے میں انیس کے حق میں فیصلہ کیا۔ ہزاروں لوگ اقبال کو یہی درجہ دینے کو آمادہ ہوں گے۔ بہرحال وہ غالب ہوں یا انیس یا اقبال یا میر اردو دان سب سے بڑا اور بلند تر ہے۔ نیز غالب صرف غزل گو اور خطوط نویس تھے اردو کے خدمت گزاروں، ادیبوں، شاعروں، ڈرامہ نویسوں وغیرہ کو نظر انداز کرنا ٹھیک نہیں۔ غالب کا مرتبہ کتنا ہی بلند ہو جزو کل سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

میرے خیال میں انجمن کی مجوزہ عمارت کا نام "اردو بھون" بہتر اور مناسب ہوگا۔ خاص کر اس لئے کہ دہلی میں بیسیوں سرکاری دفتر، عوامی اور خانگی کوٹھیاں بھون کہلاتی ہیں۔ جرمن سفارت گاہ نے جرمن تعلیم اور اطلاعات کے مرکز کا نام جرمن مستشرق کی یاد میں ماکس میولر بھون رکھا ہے۔ غرض راشٹرپتی بھون، کرشن بھون، وگیان بھون، کے ساتھ اردو بھون ہم آہنگ بھی ہوگا اور مناسب بھی۔

اس نام کی تائید میں اس حقیقت کا حوالہ دینا بھی مناسب ہوگا کہ قلعہ آگرہ میں ایک چوکور حصہ ہے جسے مچھلی بھون کہتے ہیں جس کا ذکر PICTURESQUE INDIA میں ۱۸۹۸ء کی شائع شدہ کتاب A HISTORICAL GUIDE TO THE AGRA FORT نامی حکومت ہند کی شائع کردہ کتابوں میں ہے۔ اس لحاظ سے بھون کو اختیار کرنے کا تاریخی اعتبار سے بھی جواز ہے۔

(ڈاکٹر) جعفر حسن

شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

غالب کی صد سالہ برسی جوں جوں قریب آتی جا رہی ہے، ہمیں اپنی مصروفیتوں کو تیز تر کر دینا چاہئے۔ جہاں اور بہت سی باتیں قابل عمل ہیں وہاں میری بھی چند تجویزیں ہیں:۔

۱۔ انجمن کی جو نئی عمارت بن رہی ہے اس کا نام "غالب کدہ" رکھا جائے۔

۲۔ غالب سے متعلق اردو کتابوں کی ایک مفصل تشریحی فہرست تیار کی جائے یعنی غالب ببلیوگرافی۔

۳۔ "بین الاقوامی غالب" کے نام سے اردو، ہندی اور انگریزی میں ایک کتاب تیار کی جائے جس میں دنیا کی مختلف زبانوں میں غالب پر مضامین و کتاب کی تفصیلی فہرست ہو اور غالب کے ولایتی مداحوں کا تذکرہ۔

۴۔ اس کائناتی شاعر کی صد سالہ برسی بین الہندی طور پر ہی نہیں، بلکہ بین الاقوامی طور پر منائی جائے۔

۵۔ غالب اردو میوزیم کا قیام۔

۶۔ کلیات غالب کا نہایت ہی سستا ایڈیشن، عوام کی پہنچ کے مطابق، "راجندر ناتھ رچناولی" کی طرز پر۔

۷۔ آخری تجویز یہ کہ ان تجویزوں پر عمل کیا جائے۔

(خاک پائے مداحانِ غالب، اقبال کرشن)

دیویندر پرشاد سکسینہ بدایونی

منشی حب لال رعد

بزرگوں کا وطن ہنڈیا ضلع الٰہ آباد تھا۔ آپ کے والد منشی گنیش پرشاد ہنڈیا چھوڑ کر بھنڈ ریاست گوالیار میں آ رہے تھے اور کچھ اراضی بھی خرید لی تھی۔ آپ کے پھوپھا آنند پرشاد ریاست گوالیار میں کونسل آف ایجنسی کے ممبر تھے۔ رعد مرحوم کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا اس لئے آپ نے اپنے پھوپھا کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی۔ انگریزی، فارسی اور اردو گوالیار کے ممتاز اساتذہ سے پڑھی۔ انگریزی میں بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور سنہ ۱۸۹۹ء سے بھنڈ ریاست گوالیار میں وکالت شروع کر دی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ۸۰ سال کی عمر میں وکالت کو خیرباد کہہ دیا کیونکہ کمزوری کی وجہ سے آپ عدالت میں آ جا سکتے نہ تھے۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے آپ کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں مرزا داغ کے شاگرد ہو گئے۔ آپ کو مرزا سے بڑی عقیدت اور محبت تھی اور آپ اپنے استاد کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کرتے تھے۔ مرزا کی وفات کے بعد پانسات غزلیں منشی حیات بخش رسا کو دکھائیں اس کے بعد کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔

سید رفیق مارہروی نے "ہندوؤں میں اردو" میں لکھا ہے کہ آخر عمر میں کانپور قیام رہا جہاں آپ کے لڑکے جگدیش چندر بلڈنگ انسپکٹر تھے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ رعد صرف چند روز کے لئے اپنے صاحبزادے کے یہاں کانپور آ گئے تھے اس کے بعد فوراً ہی بھنڈ کو روانہ ہو گئے۔ رعد کے صاحبزادے جگدیش چندر بلڈنگ انسپکٹر نہیں بلکہ بلڈنگ انجینیر تھے۔ رعد مرحوم کا اسی سال کی عمر میں ۲۴ جولائی سنہ ۱۹۵۵ء کو بھنڈ ہی میں انتقال ہوا۔ سید رفیق مارہروی نے بغیر تحقیقات کئے ہوئے آپ کی تاریخ وفات جولائی سنہ ۱۹۵۱ء تحریر فرمائی ہے۔

رعد مرحوم کی حسب ذیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں:۔

(۱) "چراغ سخن" یہ جوانی کے زمانے کے کلام کا مجموعہ ہے جو سنہ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ حضرت تہر گوالیاری نے دیباچہ لکھا۔ دیباچہ میں فن شعر پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اس مجموعہ کی غزلوں میں پرانے فرسودہ خیالات کی پیروی نہیں کی گئی ہے۔

(۲) "مثنوی نغمۂ راز حقیقت" یہ مثنوی سنہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی اس کا موضوع حسن و عشق کی کوئی داستان نہیں جیسی کہ "گلزار نسیم" اور رعد کے استاد مرزا داغ کی مثنوی "فریاد داغ" کا ہے۔

(۳) "ارمغان سخن" یہ رعد مرحوم کا دوسرا دیوان ہے جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کی غزلوں میں بڑی پختگی شگفتگی اور روانی ہے کیونکہ یہ مجموعہ ان کی زندگی کے تجربوں کا نچوڑ ہے مگر افسوس کہ کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔

رعد مرحوم کا شمار مرزا داغ کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جس طویل عمر پائی کہ شاعری کی مشق ۵۵ سال سے زیادہ تھی۔ رعد مرحوم غزل اور نظم دونوں خوب کہتے تھے۔ کلام میں پختگی اور زبان کی صفائی ان کے قابل ذکر اوصاف ہیں۔ مرزا داغ نے اپنے خطوط میں انکی خوش بیانی اور بحر گوئی کی تعریف کی ہے۔ کلام ملاحظہ فرمایئے:۔

ساری دنیا اُس بُت کافر کی شیدائی ہوئی
اب کسی کو یہ نہیں کھٹکا کہ رسوائی ہوئی

کیوں نہ ہیں تیرے تصور کو کہوں اپنا رفیق
آ گیا وہ سامنے جس وقت تنہائی ہوئی

جھکتے ہی سجدے میں سر جاتا رہا سب اضطراب
باعثِ تسکین دل میری جبیں سائی ہوئی

آج کیا اے رعد تجھکو مل گیا ہے تو بتا
کیا خوشی پھرتی ہے تیرے دل پہ اترائی ہوئی

اُسے کینہ ہے کیوں سارے جہاں سے — کوئی پوچھے تو اتنا آسماں سے
نہ غالب دل سنو میری زباں سے — جگر جل جائے گا اس داستاں سے
کہوں کیا اہل عالم کچھ نہیں یاد — کہ اس محفل میں آیا ہوں کہاں سے
کسی کی چوٹ جو ان کے بھی دل پہ — تو وہ آگاہ ہوں دردِ نہاں سے
کیا کرتا ہوں اپنے دل سے باتیں — سنا کرتا ہوں کچھ اس بے زباں سے

دل تھام کر میں بیٹھ گیا اس کی بزم میں
دیکھا تھا اُس نے ہائے مجھے کس نظر کے ساتھ

دل لے گیا جہاں نہ گزر تھا خیال کا
پہنچے ہیں ہم کہاں سے کہاں راہبر کے ساتھ

اے رعد بھولتا نہیں مجھ کو دم سحر
پھر پھر کے اُن کا دیکھنا وہ چشم تر کے ساتھ

ہم اُٹھتے بھی تو کیا اٹھتے ترے کوچے سے اے ظالم
ہماری ناتوانی پاؤں کی زنجیر ہو جاتی

مجھے کیا نامہ بر اس سے وہاں تک تو گیا ہوتا
اگر آئی انگلی ہوتی مری تحریر ہو جاتی

چونک پڑتا تو مرے دل کا نئی بات نہیں
سوتے فتنوں کو جگاتی ہے تمہاری آواز

غنچۂ دل ہمہ تن گوش ہوا ہے اے رعد
پھول کی طرح کھلا سُن کے کسی کی آواز

دلبر کی جگہ درد رہا کرتا ہے دل میں — گھر اور کا تھا آہ ہوا اور میں کمیں کا

فلک کو ناز ہے کیا خاک اپنی فتنہ سازی پر
ابھی کچھ اور سیکھے اُن کے کوچے کی زمیں ہو کر

اُردو ہال حیدرآباد میں اُردو سیمپوزیم

حیدرآباد۔ ۱۴ اکتوبر۔ "آزادی کے بعد اُردو کا موقف اور اس کے مسائل" پر اُردو ہال میں ایک سیمپوزیم منعقد ہوا۔ مقررین نے ہندوستان میں اُردو کے موجودہ موقف پر تشویش اور بے اطمینانی کے ملے جلے جذبات کا اظہار کیا اور اس بات پر زور دیا کہ دستورِ ہند میں اس زبان میں جو تحفظات اور سہولتیں دی گئی ہیں اُن پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو مؤثر عمل درآمد کا انتظام کرنا چاہیئے۔ اُردو بولنے والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی زبان اور مفادات کے تحفظ و ترقی کے لئے ٹھوس اور مضبوط بنیاد و نئے جوش، استقلال، عزم اور خلوص کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو بھی پورا کریں۔ یہ سیمپوزیم مجلہ عثمانیہ کی مجلس ادارت کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ صدارت مسٹر حبیب الرحمٰن معتمد انجمن ترقی اُردو نے کی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے کہا کہ غدر کے بعد ہی اُردو کی ترقی و ترویج میں روڑے اٹکائے گئے لیکن جنوب میں حیدرآباد نے جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ اُردو کی ترقی میں حصہ لیا۔ لیکن یہاں اُردو کا محل ریت پر کھڑا کیا گیا۔ اب ہم اُردو کو ثانوی حیثیت سے تسلیم کرانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ حیدرآباد میں سرکاری اُردو کالج اور دار الترجمہ قائم کیا جائے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنی تقریر میں کہا کہ تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے رجعت پسند طاقتیں ملک کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ اول الذکر طاقتیں زبان کے مسئلے کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا کر اُلجھا رہی ہیں۔ اُردو زبان کو نظم و نسق میں اُردو بولنے والوں کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے صحیح مقام دینا چاہیئے۔ پنچایت سمیتیوں اور ضلع پریشد ایکٹ میں اقلیتی زبانوں اور اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی گنجائش بھی فراہم کی جانی چاہیئے۔

مسٹر حبیب الرحمٰن نے صدارتی تقریر میں کہا کہ اُردو کے تعلق سے ہمیں مایوسی کا شکار ہونے اور ایسے ہی مایوس کن خیالات سے گمراہ نہیں ہونا چاہیئے۔ جس زمانے میں حیدرآباد کی سرکاری زبان اُردو تھی اس وقت بھی عام اُردو بولنے والوں کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اُن کی معاشی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔ زبان کے مسئلہ کا ملازمتوں کے حصول کے مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اُردو بولنے والوں کے معاشی پہلو کے تحفظ کا زبان کے تحفظ سے گہرا تعلق نہیں ہے۔

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد اور "یوم ظفر"

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کی طرف سے سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار اور تحریکِ آزادی کے رہنما بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ یادگاری تقریب ماہ دسمبر میں منائی جائے گی۔ اس سلسلے میں ادارہ نے ایک انتظامی کمیٹی یوم ظفر تشکیل دی ہے جس کے صدر دلدار حسین سابق چیف انجینئر جناب ایل، ان۔ گپتا ریاستی معتمد تعلیمات نائب صدر اور میر سراج الدین علی خاں معتمد ہیں۔

کشمیر یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں نائب صدر جمہوریہ کا خطبہ

۳۰ اکتوبر کو کشمیر یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبہ پڑھتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے فرمایا کہ آزادی ملے ۱۵ سال ہو گئے لیکن اب تک ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ آیا ہمارا نصابِ تعلیم ہمارے ٹیچروں کا تدریسی انداز اور طالب علموں کا تعلیمی رویہ کس حد تک اس تاریخی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے؟ کیا ہم نے اپنے طالب علموں کو یہ بتایا ہے کہ ایک جمہوری ریاست کے شہری ہونے کے ناتے قانون کے محافظ بھی ہیں؟

آگے چل کر آپ نے فرمایا کہ بیسویں صدی کا ہندوستان تین ہزار سال کی محنتوں کا پھل ہے اور یہ ترقی مسلسل اور مربوط ہے اور تاریخ انسانی کا ایک حصہ ہے۔ یہ ایک ایسا خاکہ ہے جس کے ایک پہلو کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرے کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں ملانے والی چیزیں ہماری کامیابیاں ہی نہیں بلکہ ہماری ناکامیاب، مایوسیاں بھی ہیں۔ یہ وہ غلطیاں بھی ہیں جو ہم نے کیں اور وہ مواقع بھی جو ہم کھو بیٹھے وہ مسائل بھی جو ہم نے پیدا کئے یا پھر ایسی ہی کوتاہ اندیشیوں کے سبب حل نہ کر سکے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے تعلیم کی تعریف کرتے ہوئے بتایا کہ یہ بذاتِ خود ایک مقصد ہے ذہن کو سنوارنے کا تخلیقی قوت حاصل کرنے کا اور قوتِ کردار پیدا کرنے کا۔

ادبی مجلس "نئی دہلی"

ادبی مجلس نئی دہلی کا جلسہ ۱۱ اکتوبر کو منعقد ہوا جس میں "آج کا افسانہ" کے عنوان سے ظفر پیامی صاحب نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج کل افسانہ نگاروں کی تعداد تو بہت ہے لیکن اچھا افسانہ بہت کم نظر آتا ہے۔

ظفر پیامی صاحب نے اپنے طویل اور تیکھے مقالہ میں اس پہلو پر زور دیا کہ آج افسانہ نگار زیادہ محنت نہیں کرتے اور وہ چار جانے پہچانے موضوعات سے وہ آگے نہیں بڑھتے۔ مثلاً سماجی عدم مساوات کا گلہ یا نچلے متوسط طبقے کی رومان پسندی جو گھر یا ماحول کی گھٹن کے سبب سسک سسک کر رہ جاتی ہے۔ بڑے افسانہ نگاروں کو آج کل عالمی موضوعات سے زیادہ دلچسپی ہے جو سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان موضوعات کو خواہ مخواہ افسانہ بنایا جاتا ہے حالانکہ کرشن چندر کے جنا، گودیاری اور خواجہ احمد عباس کے بومبا کی موت پر افسانوں کو افسانوں سے تعبیر کرنا زیادتی ہوگی۔ ان کے علاوہ جدید افسانہ کی ایک [illegible] موضوع کا افسانہ ہے جو عموماً تحلیل نفسی یا کسی نامعلوم جنسی جھوک سے شروع ہوتا ہے اور مصنف کے تھکنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ آج کے افسانے تکنیک اور پلاٹ کے اعتبار سے بہت کمزور ہیں۔ پلاٹ کی کمی کی وجہ سے غلام عباس ایسے اچھے افسانہ نگار کے تازہ مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" کے کئی افسانے افسانے قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ ممتاز مفتی اور قرۃ العین حیدر کے تازہ افسانوں میں بھی پلاٹ سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔

پروگرام کے شعری حصے میں کرشن موہن نے اپنے نئے مجموعۂ کلام "دلِ نادان" سے چند نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ جلسے کی صدارت [illegible]

پورٹ بلیر میں اُردو

پورٹ بلیر میں عرصہ چار سال سے اُردو کمیٹی قایم ہے جو اُردو زبان کی ترقی کے لئے بہترین کام انجام دے رہی ہے۔ اس ادارے کی طرف سے جامعہ اُردو علی گڑھ کے امتحانات کا سینٹر ان جزائر میں قایم ہے۔ یہ ادارہ امتحانات میں شرکت کرنے والے امیدواران کو کتابیں مفت فراہم کرنے کا بندوبست کرتا ہے۔ پورٹ بلیر میں ہونے والے مشاعروں میں اس کے ممبران کا خاص حصہ رہتا ہے۔

مستقبل میں یہ ادارہ ایک اُردو لائبریری قایم کرنے کے لئے کوشاں ہے نیز ارادہ رکھتا ہے کہ اُردو سے متعلق عظیم ہستیوں مثلاً غالب، اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے دن منایا کرے۔ ان جزائر کے مختلف حصّوں میں بھی اس ادارے کی شاخیں قایم کئے جانے کی تجویز زیرِ غور ہے۔

(ایس۔ ایس۔ بشر، پورٹ بلیر)

نظام آباد میں یومِ ظفر

نیشنل آرٹ اکیڈمی کے زیرِ اہتمام ۷ نومبر کو یومِ ظفر بصدارت جناب کے۔ وی۔ گنگادھر صدر مجلس بلدیہ و صدر کانگریس نظام آباد ٹاؤن ہال میں منایا جا رہا ہے۔ طلبہ طالبات کے لئے تحریری و تقریری مقابلہ بعنوان "ظفر بحیثیت قومی قائد" اور "ظفر بحیثیت شاعر" رکھے گئے ہیں۔ نیشنل آرٹ اکیڈمی کی جانب سے ظفر کے کلام کو سازو سُر میں پیش کیا جائے گا اور ۷ نومبر کو طرحی مشاعرہ منعقد کیا جائے گا۔ طرحی مصرع۔ "آنکھیں کھلی رہیں گی ترے انتظار میں"۔

نیز۔ اس سلسلے میں کچھ مواد یا لٹریچر مہیا ہو سکتا ہو تو روانہ فرمائیں گے۔ تو مناسب ہے۔

(سکریٹری۔ نیشنل آرٹ اکیڈمی)

تعزیتی جلسے

انجمن تعمیرِ اُردو دلی

انجمن تعمیرِ اُردو دلی کے زیرِ اہتمام ۱۴ر اکتوبر ۶۲ء کو حضرت نوح ناروی کی یاد میں تعزیتی جلسہ ہوا، جس کی صدارت علامہ پنڈت ترلبھون ناتھ زار زتشی دہلوی یادگارِ داغ نے فرمائی۔

ابتدا میں سکریٹری انجمن گلزارِ دہلوی نے نوح صاحب کی زندگی اُن کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ نیز دلی سے بے پناہ عقیدت کے واقعات سُنائے۔ جناب سلام مچھلی شہری، ڈاکٹر خلیق انجم، اجمل اجملی اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے تقریریں کیں اور یہ کہا کہ نوح صاحب کی موت ایک فرد کی موت نہیں بلکہ ایک انجمن اور تہذیب کی موت ہے ایک جماعتی اور تہذیبی حادثہ ہے۔ جب تک زبان اور فن زندہ ہیں نوح صاحب بھی زندہ ہیں۔ وہ اُردو ادب کے ایک عظیم ورثہ کا پہلو تھے۔ (سکریٹری)

"غزلستان" حیدرآباد

"غزلستان" کی جانب سے ۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر اظہارِ سوگ کے لئے تعزیتی جلسۂ عام منعقد ہوا جس کو نواب میر احمد علی خاں صاحب، زیرِ تعمیرات و اوقاف آندھرا پردیش، پروفیسر ابوظفر عبدالواحد، پروفیسر عالم خوندمیری، پروفیسر سید محمد، شہریار کاوس جی صاحب اور روحی قادری نے مخاطب کیا۔

طالب رزاقی، مظہر کامل، نصیر عارف، حمید روشن، صلاح الدین نیّر اور علی افسر نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ادب دوستوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ (مظہر کامل)

"بزمِ جیون" حیدرآباد

بزمِ جیون کے زیرِ اہتمام ۲۹ر ستمبر کو ایک شب "جیون محل" چارکمان میں اُردو کے عظیم رہنما ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے سانحۂ ارتحال کے سلسلے میں ایک جلسۂ تعزیت ہوا جس کی صدارت جناب یدھ وِیر صاحب ایڈیٹر روزنامہ ملاپ نے کی۔ جناب جمیل احمد صاحب رکن بلدیہ نے ڈاکٹر زورؔ کے تحقیقی کام سے متعلق تقریر کی۔ اوج یعقوبی نے "ڈاکٹر زور اور ایوانِ اردو" کے زیرِ عنوان ایک مضمون پڑھا۔ (فیض الحسن خیال)

بزمِ ادب گجرات کالج احمد آباد

ڈاکٹر زورؔ کی وفات کے سلسلے میں ۲۷ر ستمبر ۱۹۶۲ء کو بزمِ ادب گجرات کالج احمد آباد کا تعزیتی جلسہ پروفیسر مسز عرضی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدرِ جلسہ نے تعزیتی تجویز پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کا ذکر کیا اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ تجویز منظور کرتے ہوئے حاضرین جلسہ احتراماً ۲ منٹ تک خاموش کھڑے رہے۔ (سکریٹری)

قابلؔ اجمیری کا انتقال

اودے پور۔ ۸ر اکتوبر کو راجستھان کے جواں سال شاعر قابلؔ اجمیری کے سانحۂ وفات کے سلسلے میں جناب لکشمی نراین فارغ جے پوری کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ ابتدا میں عابد حسین ادیب اور رئیس اجمیری نے قابلؔ کی زندگی اور اس کی شاعرانہ شخصیت پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ایک تعزیتی تجویز جلسے نے منظور کی۔

شرکائے جلسہ میں اختر اودے پوری، رئیس اجمیری، جعفر بی۔ اے، مشفق بیناویری، عابد حسین ادیب، ظفر مرادآبادی، لطیف اودے پوری، حفیظ، تنویر، محمد حسین، برق اودے پوری وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔ (عابد حسین اودے پوری)

بزمِ ادب گورنمنٹ کالج اجمیر

گورنمنٹ کالج اجمیر کی بزمِ ادب کی جانب سے ۲۲ر اکتوبر ۶۲ء کو ایک ہنگامی جلسہ ہوا جس میں قابلؔ اجمیری اور نوح ناروی کے انتقال پُرملال پر دلی رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ (سید صفی محمد چشتی)

بقیہ

ڈاکٹر زورؔ مرحوم

علمی اور ادبی معاملات میں زورؔ صاحب کے خیالات اپنے بعض احباب کے تصورات سے ہم آہنگ نہیں تھے، اور تصورات کے اس اختلاف نے ذرا گہرا رنگ بھی اختیار کر لیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ زورؔ صاحب جب ان حضرات کا ذکر کرتے تو ان کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو جاتا اور ان کی گفتگو کا دائرہ وسیع ہو کر نجی زندگی کے حوالوں کا بھی احاطہ کر لیتا لیکن زورؔ صاحب نے اپنے قلم یا عمل سے کبھی کسی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے اور یہ بات ان کی عظمت کی شاہد ہے۔ انسان کی چھوٹی چھوٹی اور غیر مضرت رساں کمزوریوں میں بشریت کی شان نظر آتی ہے۔ آدمی کی حقیقی عظمت اس میں نہیں کہ وہ اوتاروں کی صف میں جا کھڑا ہو، انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ بشریت کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے بھی انسانیت کی سطح سے نیچے نہ آئے۔

زورؔ صاحب کے طرزِ تکلم کا ایک خاص پہلو بھی ذکر کے قابل ہے۔ جن احباب اور خاص طور پر شاگردوں اور نیازمندوں سے ان کی خاص راہ و رسم ہوتی اور جن پر زورؔ صاحب کی جتنی زیادہ شفقت و مہربانی ہوتی وہ ان سے اتنی ہی زیادہ بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتے۔ اپنے خلوص کے اظہار کا ان کے یہاں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ اس شخص کی غلطی یا کبھی کبھی اس کی کسی غلط فہمی پر اس کی اچھی طرح تنبیہ کرتے تھے اور اگر وہ شخص ان کی باتوں کا بُرا مان لیتا تو انھیں دُکھ ہوتا کہ اُن کے خلوص کی قدر نہیں کی گئی اور ان کے شفقت کے جذبے کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ یہ خلوص اور شفقت و نوازش کا پہلو اُن کی حرکات و سکنات اور اُن کی گفتگو میں ہر وقت نمایاں رہتا تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ ایسی میٹھی ڈانٹ کون سُنائے گا۔ ؎

تلخی اٹھائی موت کی چکھ کے خاک سب ان کو چاٹ گئی
جن کی باتیں میٹھی میٹھی مصری کی سی ڈلیاں تھیں
(ظفر)

زورؔ صاحب بڑے کشادہ قلب اور وسیع النظر شخص تھے۔ وہ صحیح معنی میں ایک "موحد" تھے جن کا "کیش ترک رسوم" تھا۔ تمام مذاہب کے پیرو ان کی نظر میں برابر تھے۔ یہ وسعت نظری اور روشن خیالی شاید انھیں اپنے مشائخ خاندان سے بھی ورثے میں ملی تھی کیونکہ صوفی کا عقیدہ تو یہ ہوتا ہے ؎

کفر و ایماں دو ندی ہیں عشق کی
آخرش دونوں کا سنگم ہو گیا
(سراجؔ اورنگ آبادی)

زورؔ صاحب کے پیام تعزیت میں حیدرآباد کی ایک سربرآوردہ سیاسی شخصیت نے صحیح کہا تھا کہ یوم محمد قلی قطب شاہ منا کر زورؔ صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور اُن میں محبت اور اخوت کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ زورؔ صاحب ہر مذہب کی تقریبوں میں شریک ہوتے اور ان سے دل چسپی لیتے تھے۔ جو لوگ مذہب کی حقیقی روح کو پا لیتے ہیں ان کے دل میں تنگ نظری اور تعصب کے جذبات کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور ان کا دل انسان دوستی اور خلوص کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے ؎

شد است سینۂ ظہوریؔ پر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

زورؔ صاحب کی شخصیت بڑی بارُعب، متین اور پروقار تھی۔ اعلیٰ سماجی حیثیت اور سیاسی اقتدار رکھنے والے لوگ بھی ان سے برابر کی سطح پر ملتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے لہجے میں بڑی گونج اور آواز میں ایک خاص طرح کی گرج تھی۔ جو شخص ان سے ایک بار بھی مل لیتا وہ ان سے ضرور مرعوب ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ ایوان اُردو میں مشاعرہ تھا۔ ہال میں تیس چالیس لوگ جمع ہو چکے تھے ابھی شاعروں کی آمد میں دیر تھی۔ زورؔ صاحب شہ نشین کے عقبی دروازے سے داخل ہوئے اور اپنے مخصوص انداز میں اسٹیج پر ٹہلنے لگے۔ نیچے بیٹھے ہوئے ایک بذلہ سنج نے برجستہ اپنے ساتھی سے کہا "اُدھر کیا دیکھتے ہو اِدھر دیکھو اسٹیج پر شیر اردو ٹہل رہا ہے۔"

زورؔ صاحب بڑے محنتی، بڑے مخلص، بڑے صاحب نظر اور جوہر شناس آدمی تھے۔ ان کی خوبیاں یاد آتی ہیں تو موت سے یہ شکوہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ؏

توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

خلیل الرحمٰن اعظمی

تبصرے

شہرِ دل

مصنف: محسن زیدی
قیمت: دو روپے
ناشر: مرکزِ ادب۔ نیا محلہ پل بنگش۔ دہلی ۶

محسن زیدی ان شعراء میں ہیں جنھوں نے ابھی چند سال پیشتر اردو شاعری سے دل چسپی رکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ "شہرِ دل" ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ۵۵ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان غزلوں کے مطالعے کے بعد ایک خوشگوار تاثر ذہن پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ شاعر کے مزاج میں نفاست و لطافت اور اس کے پیرایۂ بیان میں ایک نوع کا سلیقہ اور رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ اس مجموعے میں شروع سے آخر تک ایک ہمواری ملتی ہے۔ وہ بعض قدیم و جدید شعراء کی روایت سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً میر، غالب، مومن، جگر، فراق، فیض وغیرہ کا پرتو جا بجا ان کے شعروں پر پڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن وہ کسی ایک ہی رنگ یا انداز کے اسیر ہو کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ ان سب کی آمیزش سے اور کچھ اپنی شخصیت کے عناصر کو سمو کر ایک نیا اور تازہ اسلوب پیدا کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ اگرچہ اس مجموعے میں محسن کا کوئی منفرد اسلوب متعین نہیں ہو سکا ہے لیکن ان کے اگلے مجموعوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ غزل میں اپنی راہ نکال سکیں گے۔ بعض اشعار سے ان کے رنگِ سخن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

اس کارگہِ شوق میں جادوئے خرد نے
جتنے ہی صنم توڑے ہیں اتنے ہی بنائے

ہم اہلِ مے کدہ سے اُلجھ کر بھی دیکھتا
دامن بچا کے کیوں غمِ دوراں گزر گیا

اب تک رُکا ہوا ہے وہیں کاروانِ وقت
وہ زندگی کا موڑ جہاں تم سے ہم ملے

جن کو ملا نہ آپ کا دامن وہ اشکِ غم
نوکِ مژہ پہ آ کے پشیمان سے رہے

ہنسنے والوں میں اے محسن دل سے شاید کوئی ہنستا ہو

ہم اُلجھتے نہ کبھی بوالہوسوں سے محسن
کیا کریں آبروئے اہلِ وفا جاتی ہے

یا یہ کہ کوئی غم بھی نہ تھا اور رو پڑے
یا یہ کہ غم بہت تھے مگر مسکرائے ہیں

فکر و نظر

مصنف: اثر بھارتی
قیمت: ایک روپیہ پچاس نئے پیسے
ناشر: اردو اکاڈمی۔ پریم نگر۔ گورداس پور

جیبی سائز کی یہ چھوٹی سی کتاب قطعات، اشعار اور منظومات کا مجموعہ ہے جس کے مصنف اثر بھارتی صاحب اپنے نام کے ساتھ "شاعرِ حیات" لکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ موصوف نے خود اپنے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے یا کسی ستم ظریف نے انھیں باور کرایا ہے کہ خدانخواستہ وہ محض شاعر نہیں بلکہ فلسفی بھی ہیں چنانچہ ان قطعات و منظومات کو فلسفۂ حیات و ممات، فلسفۂ حسن، فلسفۂ ہمت و آزادی، فلسفۂ دل، فلسفۂ اعمالِ حسنہ، کام کاج کا فلسفہ، فلسفۂ مرتبۂ انسان، فلسفۂ خاک، فلسفۂ دنیا، فلسفۂ حب الوطنی جیسے بھڑکیلے عنوانوں سے مزین کیا گیا ہے۔ خاکسار تبصرہ نگار فلسفے کا طالب علم رہ چکا ہے لیکن اسے اپنی نارسائی کا اعتراف ہے کہ باوجود سعیِ بسیار ان صفحات میں کسی قسم کے فلسفے کا سُراغ نہ مل سکا۔ اب رہ گئی ان کی شاعرانہ نوعیت، تو اس سلسلے میں بھی قاری کو ہر جگہ منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ زبان و بیان کے سلسلے میں بھی اثر صاحب کا اپنا علیحدہ فلسفہ ہے۔ "کام کاج" کے فلسفے کے سلسلے میں ایک قطعہ ملاحظہ ہو:۔

اے اثر ہڑتال ہے سرمایۂ صد شور و شر
پھیلتا ہے کارخانوں میں بُرا اس سے اثر
کام بند ہونے سے ہے نقصان ملک و قوم کا
کیوں حکومت نہ اُڑا دے ایسے ہڑتالی کا سر

منظومات جنھیں "فلسفۂ حب الوطنی" کا نام دیا گیا ہے، "بھارت کی جے ہو" کے عنوان سے دو نظمیں ہیں۔ یہ ابتدائی درجوں کے نصابی ترانوں کی وضع کی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ نصابی نظمیں بے عیب ہوتی ہیں لیکن اثر صاحب نے اپنے عیب سے ہی ہنر کا کام لینے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال یہ مجموعہ ہر اعتبار سے دل چسپ اور قابلِ دید ہے۔

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

پڑھئے لکھئے

[illegible]

مجھے [illegible] یہ سلسلہ جاری ہے

پبلشر [illegible] حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا۔